



فہرست

ادب و مزاح

۱. انگش و نگش
۳. بے چین

انکشافات

۶. نپولین

بچوں کی دنیا

۷. ہائے میرا بچپن!!!!

سائنس / ٹیکنالوجی

۹. کمپیوٹر وائرس
۱۰. ہائی ٹیک

معاشرہ اور ثقافت

۱۲. بہتر گھر
-

اس مختصر انگریزی میں بھی ایسی ایسی مشکلات آن پڑی ہیں کہ کئی دفعہ جملہ سمجھنے کے لیے استیضاح کرنا پڑتا ہے۔ ابھی کل مجھے ایک دوست کاشیج آیا، لکھا تھا ”U r inv in bk crmy“ میں نے حیرت سے بیچ کو پڑھا، اللہ جانتا ہے تین چار دفعہ مجھے شک گذرا کہ اس نے مجھے کوئی گندی سی گالی لکھی ہے، دل مطمئن نہ ہوا تو ایسی ہی انقش کھینے اور سمجھنے کے ماہر ایک اور دوست سے رابطہ کیا، اس مرد مجاہد نے ایک سیکنڈ میں ٹرانسلیشن کر دی کہ لکھا ہے You are invited in book's ceremony!!!

انگریزی کے بدلے ہوئے رنگ صرف میں تک محدود نہیں، اب تو کوئی صحیح انعکاس بھی جملہ کچھ جائے تو اس کی ذہنی حالت پر چک ہونے لگتا ہے، مادر ہونے کے لیے انگریزی کا بیڑا غرق کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے، میں تو کہتا ہوں انگریزی کی صرف مانگ ہی نہیں، دلت بھی توڑ دینے چاہئیں، اس بددلت نے ساری زندگی ہمیں خون کے آنسو دلایا ہے۔ سزاہ ترین اطلاعات کے مطابق اب انگریزی کھسنے کے لیے گرامر اور Tenses بھی غیر ضروری ہو گئے ہیں۔ یعنی اگر کسی کو کہا کہو کہ ”میں تمہارا منتظر ہوں، تم اب تک آؤ گے؟“ تو بڑی آسانی سے اسے پچھلیوں میں یوں کھسا جاسکتا ہے m wtg u cm whn!۔۔۔!!!

مصنف: یوسف

آج سے کچھ سال پہلے تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں فارسی، عربی، پشتو اور اشادوں کی زبان تو سیکھ سکتا ہوں لیکن انگریزی نہیں، لیکن اب جو حالات چل رہے ہیں ان کو مد نظر رکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یا تو مجھے انگریزی آگئی ہے، یا سب کو بوجھل گئی ہے۔ کچھ بھی ہو، میری خوشی کی انتہا نہیں، اب سارے سپینک بدل گئے ہیں اور دو تین لفظوں میں ساگئے ہیں۔ اب Coming لکھتا ہو تو صرف cmg سے کام چل جاتا ہے۔ گرل فرینڈ GF ہوگئی ہے اور فیس بن FB بن گئی ہے۔ اب کوئی انگریزی کا لبا لفظ لکھتا ہو تو اس سے پہلے کے چند الفاظ لکھ کر ہی ساری بات کہی جاسکتی ہے، میں نے سارے تین سال کی ”نمایشِ مہفوت“ کے بعد unfortunately کے سپینک یاد کیے تھے، آج کل صرف Unfort سے کام چل جاتا ہے یعنی جہاں سے مشکل سپینک شروع وہیں پہ ختم۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو

”شارٹ پیئر“ کی وہ قسم ہے جو کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں نہیں پڑھائی جاتی۔ اس زبان میں خوبیاں تو بہت ہیں لیکن ایک کی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی، یہ جذبات سے عاری زبان ہے، یہ چند لفظوں میں دو ٹوک بات کرنے کی عادی ہے، اس زبان میں کسی کی موت پر sad v لکھ دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے، یہ محبتوں اور احساسات سے محروم زبان ہے۔ میں یہ زبان کچھ کچھ سیکھ چکا ہوں، لیکن استعمال کرنے سے گھبراتا ہوں، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اگر میں نے بھی یہ زبان شروع کر دی تو مجھ میں اور روباوت میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

§§§

بے چین

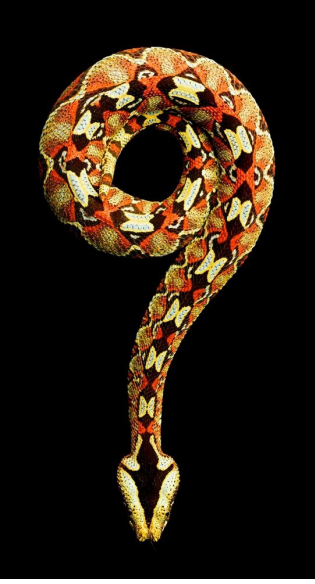
مصنف: یوسف

میکوئن نے سامنے بیٹھے امیدوار کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دہلا پتلا گندی رگت کا آدمی کام کی تلاش میں آیا تھا۔ میکوئن نے اُسے بتایا کہ یہ کام بہت مشقت والا اور عارضی ہے تمہیں نقد ادائیگی کی جائے گی۔ یہ پرانی عمارتیں گرانے کا کام ہے جس میں خطرہ بھی ہے لیکن بیمہ یا صحت کے علاج کے سلسلے میں ممداری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

رام لعل نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا تعلق بھارتی علاقے راجستھان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ وہ طب کی تعلیم پانے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس کا آخری سال تھا، اپنی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اُسے مزید آمدن درکار تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیکیدار کے دفتر عارضی ملازمت حاصل کرنے آیا تاکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کچھ آمدن حاصل کر سکے۔ میکوئن نے رام لعل سے کہا، وہ کل سے کام پر جائے۔ اوقات صبح ۷ بجے سے شام کے ۷ بجے ہیں۔ تمام مزدوروں کو ٹرک صبح ۶ بجے اسٹیشن کے سامنے سے لیتا ہے۔ ان کا انچارج بل کیمرن ہے، میں اسے بتا دوں گا۔ رام لعل دفتر سے باہر آیا اور ایک کمرہ تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے بعد اسے اسٹیشن کے قریب ایک کمرہ مل گیا۔ اتوار کے روز وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس کمرے میں مستقل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت وہ بسز پر لینا اپنے گاؤں کی پہاڑیوں، کیمپوں اور کسانوں کو یاد کرتا اور سوچتا رہا تھا کہ جلد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن کر گاؤں چلا جائے گا۔ پیر کی صبح رام لعل جلدی اٹھا اور ۶ بجے کے قریب مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک پہنچ گیا۔ اس وقت تک ۱۲ افراد جمع ہو چکے تھے۔ رام لعل کچھ دور ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں گروپ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس کے پاس مزدوروں کی فہرست تھی اور وہ سب کو جانتا تھا۔ رام لعل اُس کے قریب پہنچا تو فورمین نے پوچھا ”کیا تم وہی کالے آدمی ہو جسے میکوئن نے ملازم رکھا ہے۔“ اس نے کہا ”ہاں میں ہی ہری کشن رام لعل ہوں۔“ فورمین بل کیمرن کا رویہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ اس کا قد ۶ فٹ ۳ انچ اور جسم طاقتور تھا، شکل سے بھی وہ ایک پہلوان معلوم ہوتا۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس نے محارت سے زمین پر تھوکا اور رام لعل سے کہا ”جاؤ ٹرک میں بیٹھو۔“ دوران سفر ایک شخص نے پوچھا ”تم کہاں سے آئے ہو۔“ اس نے کہا ”بھارت کے علاقے راجستھان سے۔“ آدمی نے پوچھا ”کیا تم عیسائی ہو؟“ رام لعل نے کہا ”میں ہندو ہوں۔“ اس شخص نے پھر جس کا نام برنس تھا، باقی لوگوں سے رام لعل کا تعارف کرایا۔ ایک

شخص نے کہا ”تمہارے پاس کھانا نہیں ہے؟“ رام لعل نے کہا ”میں کل سے لاؤں گا۔“ دوسرے شخص نے پوچھا ”کیا تم نے ایسا مشق کام پہلے کیا ہے؟“ رام نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس شخص نے کہا ”تمہیں مضبوط جوتے اور دستانے بھی خریدنے ہوں گے۔“ باتوں باتوں میں رام لعل نے بتایا کہ وہ طب کا طالب علم ہے اور اسے مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے تاکہ کچھ زائد آمدن حاصل کر سکے۔ ٹرک ڈویڈز روڈ پر ایک کچے راستے پر درختوں کے قریب رک گیا۔ وہاں کومبر کے کنارے شراب کی ایک پرانی ٹیکری تھی جسے گرایا جاتا تھا۔ عمارت کے مالک کی خواہش تھی کہ کم سے کم رقم خرچ ہو۔ لہذا اس نے کسی بڑی کچنی کے بجائے ٹھیکیدار میکوئن سے بات کی جو مناسب رقم میں بغیر مشینری کے عمارت گرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میکوئن کے مزدوروں نے یہ کام بھاری ہتھوڑوں اور کدالوں کی مدد سے کرنا تھا۔ میکوئن کو یہ بھی لالچ تھا کہ عمارت ٹوٹنے سے نکلنے والی لکڑی اور سیکڑوں ٹن ایشیں فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل ہوگی۔ مزدور اوزار اٹھائے عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس بڑے ہتھوڑے، لمبی چھپیاں اور رے تھے۔ فورمین نے کہا ”چلو ابھی کام شروع کرو۔ ہم سب سے پہلے چھت کی ٹائلیں توڑیں گے۔“ رام لعل نے اندر چھت دیکھی جو کسی چار منزلہ عمارت کے برابر اونچی تھی۔ اسے اونچائی سے خوف آتا تھا۔ ایک آدمی نے پرانی لکڑی کا دروازہ توڑا اور آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ سب لوگوں نے تاج چینی کے گم ٹکالے اور چائے پیئے۔ رام لعل نے سوچا کہ کل وہ گم بھی خرید لے گا تاہم برنس نے اپنے گم میں رام لعل کو چائے دی۔ چھت پر کام شروع ہو گیا۔ ٹائلیں اکٹار کے نیچے چھت چینی گئیں۔ ۱۲ بجے کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا اور سب لوگ نیچے آگئے۔ چائے بنی اور رام لعل کے سوا سب مزدوروں نے کھانا کھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو جگہ جگہ سے چھل گئے تھے اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ برنس نے رام لعل سے کہا ”لو تم بھی سیٹھو دج کھا لو، میرے پاس کافی ہیں۔“ بل کیمرن سامنے بیٹھا تھا، اس نے برنس سے کہا ”تم کیا کر رہے ہو۔ کالے کو اپنا کھانا خود لانے دو، تم صرف اپنی فکر رکھو۔“ برنس نے اپنی نظریں جھکا لیں کیونکہ کوئی بھی فورمین کے آگے نہیں بول سکتا تھا۔ پورے ہفتے کام چلتا رہا۔ عمارت کی چھت، دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں نیچے نیچے کے ڈھیر پر گرتی رہیں۔ رام لعل کے لیے یہ سخت محنت کا کام تھا، ہاتھ زخمی ہو گئے لیکن رقم کی خاطر وہ محنت کرتا رہا۔ اس دوران فورمین بل کیمرن جیسے لوگ ”بگ ملی“ بھی کہتے تھے، رام لعل کے چھپے لگا رہا۔ مشکل سے مشکل کام اسے دیا جاتا اور وہ بے عزتی کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ ہفتے کے روز تک اندر کا کام پورا ہو چکا۔ اب باہر کی دیواریں باقی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیواروں میں نیچے ڈانکناٹ لگایا جاتا تو ایک ساتھ پورا لمبے نیچے آگرتا۔ لیکن میکوئن کے

لیے یہ طریقہ ناقابل عمل تھا۔ اس کے لیے لائسنس کی ضرورت تھی جو شمالی آئرلینڈ میں مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ محکمہ ٹیکس اور انشورنس والوں کو بھی ادائیگی کرنا پڑتی۔ لہذا یہ سارا کام مزدوروں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ خود کو خطرہ میں ڈالنے دیواریں ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔ کھانے کے وقت فورمین نے اوپر اوپر گھوم کر کام کا جائزہ لیا اور پھر کہا کہ اس طرف کی دیوار کا بڑا حصہ پہلے توڑنا ہے۔ پھر وہ رام لعل کی طرف مڑا اور کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم اوپر چڑھو اور جب دیوار گرنے لگے تو اسے باہر کی طرف دھکا دو۔“ بل کیمرن جانتا تھا کہ رام لعل اونچائی سے ڈرتا ہے۔ رام لعل نے جواب دیا ”اس پوری دیوار میں دراز پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اوپر گیا، وہ اس کے ساتھ ہی گرے گا۔“ بل کیمرن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ چیخ کر بولا ”تم مجھے میرا کام مت سمجھاؤ۔ کالے آدمی جیسا تم سے کہا، وہی کرو۔“ رام لعل اٹھا اور فورمین کے سامنے جا کر بولا۔ ”مسٹر کیمرن! ایک بات صاف ہوئی چاہیے۔ میرا تعلق راجپوت قبائل سے ہے۔ گو اس وقت میرے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے رقم کم ہے لیکن میرے آباء و اجداد میں دو ہزار سال قبل راجہ، مہاراجہ، شہزادے اور فوج کے سپہ سالار گزرے ہیں۔ اس وقت تم لوگ بندروں کی طرح چاروں ہاتھ پیر پر چلتے اور کپڑوں کی جگہ کھال پہنتے تھے۔ براہ مہربانی آپ میری بے عزتی کرنا بند کر دیں۔ ہر انسان کی اپنی عزت ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔“ رام لعل کی یہ مختصر تقریر سب لوگوں کے دم بخود کی۔ بل کیمرن کا غصہ اتنا کہ پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر گالی دی اور کہا ”اچھا تو تم واقعی عزت اور تھے۔“ ساتھ ہی اس نے رام لعل کے منہ پر اٹکے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پتھارا رام لعل زمین سے اُڑ کر کئی فٹ دور جا کر گر کر برنس کی آواز آئی ”لوڑکے زمین سے اٹھنا مت، ورنہ بگ ملی تمہیں جان سے ہی مار دے گا۔“ رام لعل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیواروں بل کیمرن مٹھیاں بند کئے اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ رام لعل کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے پڑا رہا۔ ڈھک اور بے عزتی کی تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بند آنکھوں سے رام نے خود کو وطن میں پایا جہاں اس کے آباء و اجداد گھوڑوں پر سوار، تلواروں اور نیزوں سے لیس آس پاس سے گزرتے اسے صرف ایک لفظ کہہ رہے تھے ”انتقام، انتقام۔“ تمہیں اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہوگا۔“ رام لعل خاموشی سے اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ سارا دن وہ کسی سے بولا اور نہ کوئی بات کی۔ اس رات جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو باہر گرج چمک ہو رہی تھی اور طوفانی بارش کے آثار تھے۔ وہ بسز پر لیٹ گیا اور کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے انتقام لے سکے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہونے لگی۔ اس کی نظر کھڑکی کے شیشے پر پڑی جہاں بارش کی بوندیں ایک قطار کی شکل میں بہنے لگی تھیں۔ شیشے پر پڑی مٹی کی وجہ



چند سیکنڈ بعد اس نے پائپ اور تہاکو کی تھیلی نکالی، پائپ بھر کر چلایا اور پینا شروع کر دیا۔ رام لعل مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا کہ اس کی چال نے اپنا کام نہیں دکھایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے جینٹ کی طرف دیکھا۔ اسے چند سیکنڈ کے لیے جینٹ کے ایک کنارے پر کوئی چیز چلتی نظر آئی۔ جینٹ کی جیب میں پائے جانے والے چھوٹے سے سوراخ سے سانپ نکل کر اندرونی سلائی میں چھپ گیا۔ تھام کو واپسی کے وقت فورین نے اپنی جینٹ اتار کر اپنے ہاتھ پر رکھ لی اور مقررہ مقام پر سب لوگ اتر کر اپنے گھر جانے لگے۔ رام لعل نے برنس سے پوچھا کہ کیا بل کیمرہ کے بیوی بچے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ رام لعل اپنے کمرے پہنچا اور دل سے دعا کرنے لگا کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ بل کیمرہ سے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانا میرا مقصد ہرگز نہیں۔ اقوام کا دن بھی انہی سوچوں میں گزر گیا۔ پھر کی صبح بل کیمرہ اور اس کے بیوی بچے صبح ۶ بجے کے قریب اٹھے اور ناشتا کرنے باورچی خانے میں منع ہو گئے۔ بل کیمرہ کام پہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ ذرا میری جینٹ تو لانا۔ وہ الماری سے نکال کر لائی۔ بل نے کہا: ”اسے دروازے کے پیچھے ٹانگ دو۔ میں ابھی لیتا ہوں۔“ جب بیٹی نے جینٹ مانگی تو وہ پھسل کر باورچی خانے کے فرش پر گر پڑی۔ بیٹی نے غصے سے کہا ”تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ جینٹ اٹھا کر اچھی طرح مانگو۔“ ”ہاں، یہ آپ کی جینٹ سے کیا چیز گری۔“ بگ بی کی بیوی، بیٹے اور سب نے اس طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جاندار فرش پر پڑا۔ پچھلی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

پرنسے، سانپ اور دیگر جانور فروخت ہوتے تھے۔ اُسے دراصل ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔ دکاندار نے بتایا کہ تھامری خوش قسمتی ہے کہ کل ہی میرے پاس ایک چھوٹا سانپ آیا ہے جو آراکھیراناگ (Saw Scaled Viper) کہلاتا ہے۔ یہ سانپ مغربی افریقہ سے عرب، ایران، پاکستان اور بھارت کے خشک اور نم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۵-۱۰ سینٹی میٹر تک، رنگ گہرا بھورا اور جسم پتلا ہوتا ہے۔ زہریلے دانت شکار کی جلد پر سوئی جیسے دو سوراخ چھوڑتے ہیں۔ زہر اتنا تیز اثر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت کا سبب دماغ میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔ رام لعل نے دکان کے مالک سے پوچھا کہ اس سانپ کی کیا قیمت لوگے؟ کچھ دیر بحث کے بعد سودا ۳۵۰ روپے میں طے ہو گیا۔ رام لعل سانپ کو ایک ڈھکن والی بوتل میں بند کر کے گھر چلا آیا۔ لندن سفر کے لیے رام لعل نے ایک سگار بکس خریدا۔ اسے خالی کر کے اس میں پندرہ چھوٹے سوراخ کیے اور سانپ نرم پتوں کے ساتھ سگار بکس میں بند کر کے اسے اچھی طرح ٹیپ سے بند کر دیا۔ اس طرح لندن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ تھام کو رام لعل اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے سگار بکس نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل صحیح حالت میں سیاہ چمک دار آنکھوں سے رام لعل کو گھور رہا تھا۔ رام لعل نے شیشے کا ایک ڈھکن دار مرتبان خالی کیا تاکہ صبح استعمال کیا جائے۔ صبح جلدی اٹھ کر اس نے انتہائی احتیاط سے سانپ کو سگار بکس سے مرتبان میں منتقل کیا۔ مضبوطی سے ڈھکن لگایا اور اسے اپنے بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔ مقررہ وقت وہ اسٹیشن پہنچا جہاں سے ٹرک سب مزدوروں کو لیے کام کی جگہ جاتا تھا۔ بل کیمرہ کی یہ علامت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی جینٹ اتار کر کسی شاخ پہ تار دیتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ جینٹ کی جیب سے اپنا پائپ اور تہاکو کی تھیلی نکال کر پائپ ضرور پیتا۔ رام لعل کا ارادہ تھا کہ وہ موقع پا کر سانپ کو بل کیمرہ کی جینٹ کی جیب میں چھوڑ دے گا۔ پھر وہ جینٹ کی جیب سے پائپ اور تہاکو نکالے گا۔ اس دوران سانپ بل کیمرہ کو ڈس لے گا۔ بل کیمرہ گھبرا کر ہاتھ جیب سے نکالے گا، تو سانپ اس کے ہاتھ سے لٹکا ہوگا کیونکہ اس کے دانت گوشت میں گڑے ہوں گے۔ مضبوطی کے مطابق رام لعل کسی بہانے ۱۱ بجے کے قریب اٹھا۔ اپنا لٹچ بکس کھول کر سانپ کا مرتبان نکالا، ڈھکن کھول کر بل کیمرہ کی جینٹ کی داہنی جیب میں اتار اور فوراً واپس آکر کام میں لگ گیا۔ کھانے کے دوران سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر سینہ دوج کھانے لگے۔ رام لعل کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا، وہ زبردستی سب کے ساتھ بیٹھا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر فورین کی جینٹ کی طرف دیکھتا۔ آخر کار بل کیمرہ نے کھانا ختم کیا، اٹھ کر اپنی جینٹ کی طرف گیا اور داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

سے پانی کی قطار سیدھی کے بجائے لہرائی ہوئی بہنے لگی۔ اچانک رام لعل کی نظر کونے پر پڑی ڈرینگ گائون کی ڈوری پہ گئی جو ہوا سے نیچے گر گئی تھی۔ گری ڈوری ایسی گھٹی تھی کہ پتلا سانپ کندلی مارے بیٹھا ہو۔ رام لعل سمجھ گیا کہ اسے کیڑا پیر اختیار کرنی چاہیے۔ اگلے روز رام لعل بذریعہ ریل بیلٹاسٹ گیا اور اپنے سکھ دوست سے ملا۔ رنجیت سنگھ بھی اس کی طرح طالب علم تھا لیکن اس کے والدین دولت مند تھے اور اسے ماہانہ اچھی رقم اخراجات کے لیے بھیجتے۔ رام لعل نے اس سے کہا کہ مجھے گھر سے اطلاع ملی ہے، میرے والد بستر مرگ پر ہیں۔ میں سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے واپس ہندوستان جانا ہوگا۔ رنجیت سنگھ نے کہا کہ ہاں یہی روایت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بڑا بیٹا اس کے پاس ہو۔ رام لعل نے کہا، میرا مسئلہ ہوائی سفر کے ٹکٹ کا ہے۔ میں کام بھی کر رہا ہوں لیکن میرے پاس کافی پیسے نہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم اہوا دے دو گے؟ میں زندہ کام کر کے تمھاری رقم لوٹا دوں گا۔ سکھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں کل چیک سے رقم نکلا کر تمھیں دے دوں گا۔ اس روز شام کو رام لعل اپنے ٹھیکیدار مسٹر میکوشن سے ملا اور اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے۔



میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا مذہبی طریقہ ہے کہ مرنے والے کی آخری رسوم اس کا بڑا بیٹا ادا کرے۔ رام لعل نے یہ بھی کہا ”میں نے ہوائی کرائے کی رقم دوست سے اہوا لی ہے۔ اگر میں کل کی پرواز سے روانہ ہو جاؤں تو اگلے ہفتے واپس آ سکتا ہوں۔“ ٹھیکیدار نرم دل آدمی تھا، اس نے کہا ”ٹھیک ہے! تم جاسکتے ہو۔ اگر تم وعدے کے مطابق واپس پہنچ جاتے ہو تو انہی شرائط پر دوبارہ کام شروع کر دیتا۔“ رام لعل نے شکر یہ ادا کیا اور واپس آ گیا۔ اگلے روز اس نے اپنے سکھ دوست سے رقم اہوا لی اور بذریعہ ریل لندن پہنچ کر بھارت جانے کے لیے ٹکٹ خریدا لیا۔ اس طرح ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہ بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک دکان پر پہنچا جہاں پائو

اس کی داہنی کلائی پر سوئی کی ٹوک کے برابر دو انتہائی باریک سوراخ ہو چکے تھے۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ سب لوگ کام کے لیے اٹھ گئے۔ عمارت توڑنے کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سارا ملبہ ڈبیر کی صورت میں پڑا تھا۔ دو گھنٹے بعد بل کیمرن نے اپنے ماتھے پر ہاتھ جھیرا، اسے کچھ پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہتھوڑا ہاتھ سے رکھا اور اپنے ساتھی سے کہا ”میری طبیعت کچھ خشک نہیں لگ رہی۔ میں ذرا دیر سایہ میں آرام کر لیتا ہوں۔“ پھر وہ درخت کے نیچے بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ پیٹھے پیٹھے اس کے پورے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ کر گرلا۔ سب سے پہلے پرنس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بیٹرس کو آواز دی اور کہا: ”جگ بلی بہت بیمار لگ رہا ہے۔ میری بات کا اس نے جواب بھی نہیں دیا۔“ سب مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور اس درخت کے پاس آگئے جہاں بل کیمرن زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اُن میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بیٹرس نے رام لعل کو آواز دی کہ اوپر آؤ اور اسے دیکھو۔ تم طب کے طالب علم ہو، تمھارا کیا خیال ہے؟ رام لعل کو کسی معاینے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے جھک کر نبض دیکھی اور بیٹرس سے کہا کہ یہ تو مر چکا۔ بیٹرس نے کہا ”سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ایبولینس بلاتا اور ٹھیکیدار میکون کو بھی مطلع کرتا ہوں۔“ وہ پھر پیدل سڑک کی طرف روانہ ہوا تاکہ پوچھ سے فون کر سکے۔ ایبولینس کے پچھنے پر بل کیمرن کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور بتایا کہ ہسپتال پچھنے سے پہلے ہی اس شخص کی موت واقع ہو چکی۔ میکون بھی پریستانی کے عالم میں ہسپتال پہنچ گیا۔ پولیس اور عدالتی کارروائی میں چند روز لگے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بل کیمرن کی موت قدرتی طور پر ہوئی۔ وجہ دماغ میں شدید اخراج خون تھا۔ میسائی مذہب کے طریقے کے مطابق تدفین ہوئی جس میں اس کے خاندان، میکون اور دیگر ساتھی بھی شریک ہوئے۔ رام لعل نے تدفین میں شرکت نہیں کی بلکہ وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ گھاس میں کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کچھ کہنے لگا ”اے زہریلے سانپ! کیا تم میری بات سن سکتے ہو۔ تم نے وہ کام کر دکھایا جس کے لیے تمھیں راجستھان کی پہاڑیوں سے یہاں لایا گیا تھا۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ میرے منصوبے کے مطابق تمھیں کام کرنے کے بعد مر جانا تھا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تم مر جاؤ گے۔ بغیر بلاؤ کے تمھاری نسل آگے نہیں چل سکتی کیونکہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پائے جاتے۔

باریک دو شاخہ زبان لہرائی نظر آ رہی تھی۔ بل کی بیوی بولی ”خدا ہمیں محفوظ رکھے، یہ تو کوئی سانپ ہے۔“ بل کیمرن غصے سے بولا: ”پاگل نہ ہو، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آئرلینڈ میں قدرتی طور پر کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔“ پھر اس نے بیٹے سے پوچھا: ”ہوئی، تم تو اسکول میں سائنس پڑھتے ہو، تمھارے خیال میں یہ کیا چیز ہے۔“ لڑکے نے سانپ کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: ”یہ یقیناً کچھ ہے جو عموماً جنگل کی گھاس میں پایا جاتا ہے۔“ جگ بلی نے اپنے بیٹے سے کہا: ”یہ جو کچھ بھی ہے، اسے مار کر باہر پھینک دو۔“ بولی اٹھا اور اپنا جوتا نکال کر اس جانور کو مارنے چلا۔ بل کیمرن کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا: ”ذرا رک جاؤ اور مجھے ایک ڈھکن والا مرتبان دو۔“ مرتبان آیا تو بلی اٹھا اور بہت احتیاط اور پھرتی سے سانپ کو مرتبان میں منتقل کر دیا۔ سانپ بھی آئرلینڈ کے سرد موسم سے کچھ سست ہو گیا تھا۔ بلی کے بیٹے نے پوچھا: ”ابو آپ اس کا کیا کریں گے؟“ بلی نے کہا: ”ہمارے گروہ میں ایک کالا بھارت سے آیا ہے، وہاں بہت سانپ ہوتے ہیں۔ یہاں مذا اس کے ساتھ مذاق کروں گا۔ وہ تو شاید خوف کے مارے مر ہی جائے گا۔“ اس نے جیکٹ پہنی، کھانا لیا اور بیگ میں پھر سانپ والے مرتبان کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر وہ اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں سب لوگ مع رام لعل موجود تھے۔ ٹرک میں سوار ہو کر یہ پارٹی کام والی جگہ پر روانہ ہو گئی۔ وہاں کام شروع ہونے سے پہلے چائے کے دوران بل کیمرن نے کچھ چپکے دیگر لوگوں کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کالے کے ساتھ کیا مذاق کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ یہ ایک بے ضرر کیزا ہے، رام لعل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لہذا ایسے مذاق میں کوئی حرج نہیں۔ کھانے کے وقفے میں سب لوگ حسب معمول دائرے کی شکل میں بیٹھے۔ رام لعل نے کچھ خیال نہ کیا لیکن باقی لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے اپنا لٹچ ہاس گھٹوں پر رکھا اور اسے کھولا۔ سینڈویچ اور سیب کے سچھ چھوٹا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رام لعل کی زبردست توجہ سے علاقہ گونج اٹھا اور ساتھ ہی سب مزدور بے ساختہ زور دار قہقہے لگانے لگے۔ رام لعل نے گھبرا کر اپنا لٹچ ہاس زور سے ہوا میں اچھال دیا۔ سانپ اور سینڈویچ تمام چیزیں چاروں طرف گھاس میں گر پڑیں۔ رام لعل پچھنے ہوئے کھڑا ہو گیا اور بولا ”یہ سانپ بہت زہریلا اور خطرناک ہے۔“ سب لوگ پھر سے ہنسنے لگے۔ رام لعل نے ان سے کہا: ”یقین کرو، یہ انتہائی زہریلا سانپ ہے۔“ بل کیمرن کی آنکھوں میں ہنسنے ہنسنے آنسو آ گئے۔ وہ رام لعل سے کہنے لگا: ”کالے آدمی، تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔“ جگ بلی ہنسنے ہنسنے کچھ تھک گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ گھاس پر لیٹ گیا کہ چند منٹ آرام کر لے۔ تب اسے معمولی جھپٹ کا بھی احساس نہیں ہوا۔

نیپولین

مصنف: یوسف

یہ اُس دور کی بات ہے جب نیپولین نے روس پر حملہ کیا تھا۔ اُس کے فوجی دستے ایک اور چھوٹے سے قصبے میں جنگ میں مصروف تھے۔ اتفاق سے نیپولین اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا۔ کاسک فوج کے ایک دستے نے نیپولین کو پہچان لیا اور شہر کی پُرتچ گلیوں میں اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ نیپولین اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتا ہوا ایک بگلی گلی میں واقع ایک سمور فروش کی دکان میں جاگھسا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد جوں ہی اُس کی نگاہ سمور فروش پر پڑی وہ بے چارگی سے کراہنے ہوئے بولا ”مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! مجھے کہیں چھپا دو۔“ سمور فروش بولا ”جلدی کرو! اُس گوشے میں سمور کے ڈھیر کے اندر چھپ جاؤ!“ پھر اُس نے نیپولین کے اوپر اور بہت سے سمور ڈال دیے۔



ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کاسک فوجی دستہ دندناتا ہوا اُس کی دکان میں آگھسا اور فوجی چیخنے لگے ”وہ کہاں ہے؟“ ”ہم نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھا ہے؟“ سمور فروش کے احتجاج کے باوجود اُن فوجیوں نے سمور فروش کی دکان الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ نیپولین کی تلاش میں انھوں نے دکان کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ اپنی گھوڑوں کی ٹوہیں سمور کے ڈھیر میں گھساتے رہے لیکن نیپولین کو تلاش نہ کر پائے۔ بالآخر انھوں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور واپس چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب سکون ہو گیا تو نیپولین سمور کے ڈھیر میں سے رہنمائی ہوا باہر نکل آیا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔

تین اسی لمحے نیپولین کے ذاتی محافظ بھی اُسے تلاش

اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب وہ آواز اُس کے عین نزدیک آگئی تو کسی نے ایک جھٹکے سے اُس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھول دی۔ اچانک روشنی ہونے سے سمور فروش کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، تب اُس نے نیپولین کو دیکھا جو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُس کے مقابل کھڑا تھا۔ اُس نے نیپولین کے لب وا ہوتے دیکھے۔ وہ نرم لہجے میں بول رہا تھا ”اب تمھیں پتا چل گیا؟“

§§§

کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے اور دکان میں داخل ہو گئے۔ سمور فروش کو جب اندازہ ہو گیا کہ اُس نے کس عظیم شخصیت کو پناہ دی تھی تو وہ نیپولین کی جانب گھوم گیا اور شرمیلے لہجے میں گویا ہوا ”میں اتنے عظیم آدمی سے یہ سوال پوچھنے پر معذرت چاہوں گا! لیکن سمور کے اِس ڈھیر کے نیچے جب آپ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگلا لمحہ جینی طور پر آپ کی زندگی کا آخری لمحہ بھی ہو سکتا تھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا تھا؟“ نیپولین جو اب پوری آن بان کے ساتھ تن کر کھڑا ہو چکا تھا، سمور فروش کے اِس سوال پر غصے میں آگیا اور برہمی سے بولا ”تمھیں مجھ سے، بادشاہ نیپولین سے، یہ سوال کرنے کی بہت کیوں کر ہوئی؟“

پھر وہ اپنے محافظوں سے مخاطب ہوا ”محافظو! اس گستاخ شخص کو باہر لے جاؤ۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اُسے گولی مار دو! میں بذاتِ خود اس پر فائر کھولنے کا حکم دوں گا۔“ محافظوں نے اُس بے چارے سمور فروش کو دیوبچ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر اُسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ سمور فروش کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ اُس کے کانوں میں محافظوں کے حرکت کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں جو دھیرے دھیرے ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنی رائفلیں تیار کر رہے تھے۔

ساتھ ہی اُسے سرد ہوا کے جھونکوں اور پکڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہوا کے تھپڑے اُس کے لباس سے ٹکرا رہے تھے اور اُس کے گال بچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کی ناگہیں کپکپا رہی تھیں اور وہ اُن پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تب اُس کے کانوں میں نیپولین کی آواز سنائی دی جس نے کھٹکارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور آہستگی سے بولا ”ہوشیار... شت باندھ لو۔“ اُس لمحے میں یہ جانتے ہوئے کہ اُس کے تمام احساسات و جذبات اُس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں، سمور فروش کے اندر ایک ایسا احساس نمودیر ہونے لگا، جسے بیان کرنے سے وہ قاصر تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔



ہائے میرا بچپن!!!!

مصنف: یوسف

بچپن کا حساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان بچپن کی طرف بڑھتا جاتا ہے بچپن زیادہ یاد آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یوں تو ایک خاص دور کے بچوں کا بچپن تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے مگر چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کی علیحدہ کہانی ہو گی۔ آج سے تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے مگر ہم کچھ زیادہ ہی تھے یا پھر شریر بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے بنا دیے گئے تھے۔



ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اس وقت ہماری عمر سات آٹھ سال ہو گی۔ جب ایک دن صبح داوی جان نے ہمیں چوٹی (آج کے بچوں کو کیا معلوم؟ ان کے لئے عرض ہے کہ چوٹی ایک روپے کا چوتھائی یعنی چار آنے ہوتے تھے۔ آج کے دس روپوں کے ہم پلہ سمجھ لیں) کوئی کہ سامنے والے کھوکھے سے انڈے لے آؤ۔ ہماری ہانچیں کل اٹھیں اور اپنے ہچکلے دن کے ہارے میں سوچنے لگے کہ داوی کی اس خاص مہربانی ہماری کس بات کا انعام ہے! جلدی سے sweet egg ذہ (یہ ہمارے بچپن کی خاص چیز تھی۔ میٹھی باریک انڈوں کی شکل کی گولیاں جو ایک موہائیل کے سائز کے ڈبے میں ہوتی تھیں۔ اس ڈبے پر پھتری تلے مرغی کی تصویر ہوتی تھی ہائے پر مٹھے انڈے جھٹیلی پر کرتے تو بس..... کیا مصیبت ہے! بچپن کا حال لکھیں تو ہر چیز explain کر کے بتائیں کہ آج وہ چیزیں ہی ناپید ہو گئیں) بھاگ کر لائے اور لان میں ہی بیٹھ کر کھانے لگے ایسا نہ ہو کہ برادران میں سے کوئی ایک لے اور خواہ مخواہ بٹوارا کرنا پڑے! بڑوں کی دھونس تو چھوٹوں کی ضد دونوں ہی خطرناک تھے اس معاملے میں! ذہ ختم کر کے جب اندر آئے تو داوی نے ہمارے خالی ہاتھ کو دیکھا اور انڈوں کا پوچھا تو صورت حال واضح ہوئی کہ وہ بیپاری آلیٹ کے لئے پیاز کاٹ کر شہتر تھیں کہ ہمارے آنے پر ناشے کا انتظام ہوا! جی نہیں! ڈانٹ نہ پٹائی کچھ بھی نہ ہوا ہاں مگر اپنا

لطیفہ بننا اس وقت تو پلپ لگ رہا ہے مگر اس عمر میں تو رو رو کر برا حال ہوتا جب بھی ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنا یا جاتا۔ جہاں تک شوق کا معاملہ ہے ہر بچے کی طرح ہمیں بھی کہا نیاں سنا بہت پسند تھا۔ داوی جان سال کا آدھا حصہ ہمارے گھر اور بقیہ آدھا بڑے ابا کے گھر حیدر آباد میں گزارتی تھیں۔ بچوں اور بوڑھوں کی دوستی تو دیر سے تھی۔ بچے بھی شرب الملح ہے کیونکہ ان دونوں اقوام کو ہی اصول و قواعد کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے ہیں اور جو 'لوگ کیا کہیں گے!' کے بجائے 'جہاں اور جیسے' کی پالیسی پر یقین رکھتی ہیں۔ لہذا ہم بھی اپنی داوی جان کا انتظار ان کے جاتے ہی شروع کر دیتے تھے۔ اہم ترین وجہ ان کی کہانیاں ہوتیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چونکہ بچنے اور خصوصاً کہانیاں پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ اسلئے موسم اور حالات کی پرواہ کئے بغیر دیواروں پر لکھے اشتہارات تک بڑے غور سے پڑھتے۔ اس پیکر میں بعض انہونی نہ ہو سکی کہ کئی دفعہ ہم بازار میں پھرنے سے بچے۔

نیک پر یوں کی کہانیاں بے دریغ پڑھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ ہم عام زندگی میں بھی کہا نیوں کی ٹیکنک استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یعنی یہ دیکھ کر کہ برادران اسی کو سنا رہے ہیں۔ کبھی بات نہ مان کر تو کبھی شرارتوں میں! مٹھے والوں کی شکایتیں سن کر اسی بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے نہ کوئی اختیارات تھے نہ حقوق! نہ وسائل نہ طاقت! ہاں مگر ایک ہتھیار تھا! قلم کی قوت! کسی پری کی طرف سے اپنے اس بھائی کے نام خط لکھتے جس نے کوئی نامعلوم حرکت کی ہو۔ مدعا یہ ہوتا کہ تم نے فلاں فلاں غلط حرکت کی ہے لہذا تمہیں میری طرف سے انعام نہیں ملے گا..... اب آپ خود سوچیں ایک بری سی میٹر ڈرائنگ میں پچکانہ اسٹائل میں کی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہوگی؟ اس وقت آپ سے یہ شہر کرنا اتنا برا نہیں لگ رہا مگر اس وقت بڑی شرمندگی لگتی تھی حالانکہ یہ تذکرہ ہماری تعریف میں ہی ہوتا تھا۔ بدریہ قلم اصلاح معاشرہ کے جراثیم ہمارے اندر گویا شروع سے ہی تھے۔ ہاں شعوری طور پر جب اس کا آغاز کیا تو ظاہر ہے اس کی بنیاد کوئی مہربان، نیک پری نہیں بلکہ رضائے الہی ہوگئی۔

بچپن کا ایک واقعہ جو یاد آتا ہے اس وقت کا ہے جب ہم جماعت سوم میں پڑھتے تھے۔ ہماری آرٹ ٹیچر نے اعلان کیا کہ آئندہ وہ ہمیں واٹر کولر کھائیں گی۔ ہر بچے کی طرح ہمیں بھی ڈرائنگ سے براشغف تھا۔ لہذا گھر پہنچتے ہی امی کو یہ خوشی بھری اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ فہرست بھی پکڑائی جو مس نے منگوائی تھی۔ پیٹ برش اور رنگ کے علاوہ رنگ گولے کے لئے پلاسٹک کے پیالے، اسپرن اور فائنو کپڑے وغیرہ آج تو اس میں سے کوئی بھی چیز پہنچنے سے باہر نظر نہیں

آ رہی مگر اس وقت واقعی بہت بڑی چیزیں لگ رہی تھیں۔ ذرا آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے سوچیں! اور صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے بارہ میل دور! جہاں آج کل بڑے بڑے شاپنگ سنٹر، دفاتر اور تعلیمی ادارے ہیں وہاں گھنا جنگل تھا ہوا کرنا تھا سڑک کے دونوں جانب! نزدیک ترین شاپنگ سینٹر صدر ہوا کرنا تھا جہاں صرف اسٹاف بس کے ذریعے جایا جاسکتا تھا جو مقررہ اوقات میں ہی چلا کرتی تھی۔ امی جان پہلی بس سے ہی ہمارا سلمان لائے روانہ ہو گئیں۔

اس سلمان کو دیکھ کر جو کیفیت ہوئی وہ آج بھی یاد ہے۔ خوشی بھرا اضطراب! جیسے عید کا انتظار ہوتا ہے کہڑے اور جوتے سامنے رکھ کر! جب مطلوبہ چیز شروع ہوا تو کچھ یوں منظر نامہ تھا کہ تقریباً پچیس بچوں اور بچیوں میں سے ہم واحد تھے جو پینٹنگ کا سلمان لے کر آئے تھے باقی سب خالی ہاتھ سر جھکا کر کھڑے تھے۔ نیچر نے پوری کلاس کو نافرمان کا خطاب دیا اور ہمیں اپنی میز پر بلا کر ڈرائنگ سکھانے لگیں۔ جس وقت وہ ہم پر تعریف کے ڈونگے برسار رہی تھیں اسی وقت ہر نسل بھی کارڈ بور سے گزریں۔ نیچر نے انہیں بتایا تو وہ بھی ہماری کلاس کو ڈانٹنے لگیں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ذرا بھی فخریہ احساس نہیں تھا۔ یوں تو اپنی تعریف ہر ایک کو پسند ہوتی ہے مگر اس طرح نمایاں ہونے میں انسان کتنا تنہا ہو جاتا ہے!!! کیا خیال ہے؟ شام کو اپنے پڑوسی ہم جماعت کے گھر کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنی امی سے شکایت کی کہ مجھے رنگ کیوں نہیں ملتا کہ دینے آپ نے.....! اور جب ہمارے سامنے ایسی بڑی بہن نے اس کے کان ابھنے سے کہہ کر ”تم خود کتنے خراب لڑکے ہو! تمہیں کچھ آتا بھی ہے! اس کو دیکھو کتنی اچھی بنی ہے.....“ یقین کریں میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے رنگ اسے دے دوں! اب اس وقت کے درست جذبات تو ذہن میں نہیں ہیں مگر اب سوچتے ہیں کیا حقیقی تعریف کی حقدار میری امی نہیں تھیں جنہوں نے مجھے مطلوبہ چیزیں اہمیت کے ساتھ میا کیوں؟؟ آج ہم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں مگر اس وقت تو یقیناً امی کا شکریہ ادا نہیں کیا ہوگا!

اس واقعے کا ذرا پ سین یہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے جو ابھی اسکول نہیں جاتے تھے ایک دن موقع پا کر تمام رنگ خراب کر دیے۔

اسکول سے واپسی پر جب ہم نے دیکھا تو جو ردنا شروع کیا وہ کئی دنوں بعد ہی ختم ہو سکا۔ یہ انسانی فطرت ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتا ہے اور جب چھین جانے تو واویلا کرتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں ایک اہم واقعے میں بھٹو کا شکریہ! یہ کیا بات ہوئی ہے تو انسان کو تکلیف دینے والا شیش پیالہ ہے جو احسان کا جواب بھی ذمہ دار کر دیتا ہے اس کا شکریہ کیوں؟؟

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم سارے بچے اسکول بس کے ذریعے اپنے اسکول جا یا کرتے تھے۔ یہ رواج تو آج بھی ہے کہ بچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں دور دراز جانے کی وجہ اسکولوں کا گھروں سے فاصلے پر ہونا ہوتا تھا اسٹینڈرڈ ہر گز نہیں تھے۔

تو جناب! ہماری ایک بس کی ساتھی نے ایک دن ہمیں بتا یا کہ ان کے اسکول میں اردو پاکستانی فلم دکھائی جائے گی۔ اس زمانے کے بچوں اور نوجوان نسل کے لئے سینما جاکر فلم دیکھنا بہت بڑی تفریح ہوا کرتی تھی اسج کی طرح نہیں کہ فلم just a click پر ہو! بہت سے خاندانوں میں یہ شجر ممنوعہ ہوا کرتی تھی۔ شیطان اس وقت بھی اپنے تمام حربوں کے ساتھ میدان میں ہوتا تھا لہذا مختلف تعلیمی اداروں میں اس کو دکھانے کا اہتمام کیا جاتا کہ کوئی محروم نہ رہے۔ ساتھی کی اس خبر پر ہمارا بھی بہت دل لپکا یا اور نہ جانے کس طرح امی سے اجازت اور نکلت کے پیچے لئے یہ غیر ضروری بات ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم اپنی دوست کے اسکول میں فلم دیکھنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جوتا پہنتے ہوئے بری طرح تکلیف ہونے لگی جب ہمارا جوتا اتر دیا گیا تو وہاں بچھو صاحب آرام فرما رہے تھے اور ہمارے انگوٹھے پر ڈنک مار مار کر ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ آگے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں! ہمیں فوری طور پر ٹریڈنٹ دی گئی۔ تکلیف اور فلم نہ دیکھنے کا افسوس ساتھ ساتھ رہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ ہم نے اس کا شکریہ درست ادا کیا تھا کہ اس نے ہمیں ڈنک مار کر فلم دیکھنے سے بچا کر نہ صرف ہماری معصومیت کو دفاعار ہونے سے بچایا بلکہ سنت کے مطابق چیزوں کو چھپا کر استعمال کرنے کی عادت ڈلوائی

میرا خیال ہے کہ بچپن نمبر کے لئے اتنے ہی واقعات بہت ہیں! ہمارا بچپن ہمارے دور کی جھلک ہے! کیسا لگا یہ دور؟؟

§§§

وائرس کا اثر انداز ہونا

وائرس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ وائرس ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل ہوتے ہیں اور جب وہ اپنا کام شروع کریں تو پھر وہ کسی بھی فلیش ڈسک یا ہارڈ ڈرائیو جو ایک کمپیوٹر سسٹم کا حصہ ہے ان میں منتقل ہو جاتا ہے۔

```
00 00 00-6D 73 62 6C nshl
06 75-73 74 20 77 ast.exe I just w
9 20 4C-4F 56 45 20 ant to say LOVE
06 69-6C 6C 79 20 YOU SAN!! billy
06 6F-20 79 6F 75 gates why do you
3 20 70-6F 73 73 69 make this possi
00 6D-61 6B 69 6E ble ? Stop makin
E 64 20-66 69 78 20 g money and fix
7 61 72-65 21 21 00 your software!!
00 00-7F 00 00 00 00 00 00
00 00-01 00 01 00 00 00 00
00 00-00 00 00 46 00 00 00
C C9 11-9F E8 00 00 00 00
00 03-10 00 00 00 00 00 00
3 00 00-01 00 04 00 00 00 00
```

اور اس طرح سارے نیٹ ورک اور دوسرے کمپیوٹرز میں خرابیاں پیدا کرنے لگ جاتا ہے ایسے وائرس عام طور پر Professional Main Frame Systems کی نسبت Personal Computers میں زیادہ پائے جاتے ہیں کیونکہ ان پروگرامز کو کسی فلیش ڈسک کے ذریعے پھیلا یا جاتا ہے۔ جو Personal Computers کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کے کام آتی ہے۔ وائرز صرف اس وقت عمل پیرہ ہوتے ہیں جب ان کے پروگرام کو استعمال کیا جائے لہذا اگر کوئی کمپیوٹر کسی انٹرنیٹ ورک سے منسلک ہے ضروری نہیں کہ اس کمپیوٹر خرابی پیدا ہو تاہم ایسے وائرز پروگرام ہیں جو کمپیوٹر یوزر کو لالچ دے کر اپنا پروگرام استعمال کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ایسے وائرز ہیں جو کسی اچھے پروگرام کے ساتھ اچھے ہو جاتے ہیں لہذا جب ان پروگرام کو چلایا جاتا ہے تو وائرز بھی ایکٹو ہو جاتے ہیں۔

وائرس کی تاریخ

1949ء میں ہنگری کا ایک باشندہ جو امریکہ میں قیام پذیر ہو چکا تھا یعنی (John Von Neumann) نے نیوجرسی کی ایک انسٹی ٹیوٹ میں یہ ارادہ کیا کہ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ کیا کمپیوٹر پروگرام ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں خود بخود منتقل ہو سکتے ہیں یا نہیں لہذا 1950ء کی دہائی میں ایک ایسی کمپلی بنائی گئی جس کے نتیجے میں اس کمپلی کو کھیلنے والے چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر پروگرام بناتے تھے جو اپنے حریف کے سسٹم پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسکے پروگرام کو مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔

کمپیوٹر وائرز

مصنف: یوسف

کمپیوٹر وائرز (Computer Virus) ایسا پروگرام ہے جو اپنے آپ کو ایک Computer سے دوسرے کمپیوٹر میں داخل کرتا ہے اور جس میں بھی وہ داخل ہوتا ہے اس کے ہارڈویئر یا سوفٹ ویئر میں چھپڑ چھڑا کرتا ہے۔

وائرز کا کام

وائرز کو اس طریقے سے ڈیزائن کیا جاتا ہے کہ وہ ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل ہوتے وقت یوزر کے علم سے بچ جائیں اور پتہ بھی نہ لگے کہ وائرز داخل ہو چکا ہے۔ جب وائرز کمپیوٹر میں داخل ہو جائے تو وہ کمپیوٹر کو اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے وائرز کی ان ہدایات کو جو کسی سسٹم کو خراب کرنے کا باعث بنتی ہے (Payload) کہا جاتا ہے تاہم (پے لوڈ) کسی بھی فال یا پیغام کو خراب کر دیتا ہے یا پھر اس کو بدل دیتا ہے۔ لہذا کمپیوٹر کا نظام خراب ہو جاتا ہے۔



اور بھی ایسے پروگرام ہیں جو کمپیوٹر پروگرام کے لئے نقصان دہ ہے لیکن ان میں یکساں طور پر یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں کہ وہ خود بخود ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل ہو جائیں اور پھر ان کا کھوج بھی نہ لگایا جاسکے۔ لیکن پھر بھی ایسے پروگرامز وائرز سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ کسی کمپلی کی صورت میں آسکتے ہیں اور پھر اپنا کام دکھاتے ہیں ان میں سے بعض پروگرامز ایسے ہیں جو اس وقت تک عمل پیرہ نہیں ہوتے جب تک وہ ایک خاص تاریخ یا وقت کو نہ پالیں۔ اور پھر کسی مخصوص حرف کو یوزر ٹائپ نہ کرے ایسے بھی نقصان دہ پروگرامز سامنے آتے ہیں جو اپنے آپ کو کاپی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کا حجم کمپیوٹر کی میموری پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس طرح کمپیوٹر کا کام سست ہو جاتا ہے۔

ہائی ٹیک

مصنف: یوسف

چارلی چپلن ایک لیجنڈ آرٹس تھا اس نے بہت کم عرصے میں اپنی سوچ اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت کچھ پروڈیوس کرنے کے بعد دکھا دیا کہ دنیا میں ہر طرح کے انسان بستے ہیں اس کی کامیڈی فلمیں صرف انٹرٹینمنٹ ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی تھیں اسکی نقالی آج بھی دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔ تھیٹر، سٹیج شو، سنیما اور ٹیلی ویژن نے نیا ٹریڈ لا کر دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ آج بھی کئی لوگ ان چیزوں سے شدید نفرت کرتے اور آرٹسٹوں کو میراثی اور سنگج وغیرہ کہتے ہیں حالانکہ آرٹسٹ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں انسان ہونے کے ساتھ اپنے اندر جذبات اور احساسات کا سمندر رکھتے ہیں اور آرٹسٹ سے نفرت کرنا انسانیت سے نفرت کرنے کے مترادف ہے۔ کئی برسوں تک سنیما میں اگرچہ ہر دور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا دکھایا جاتا اور شائقین محفوظ ہوتے لیکن ٹی وی آنے کے بعد انسانوں کی سوچ یکسر بدل گئی کیونکہ چھوٹی سکرین پر ایڈورٹائزنگ کی بدولت دنیا کی ہر اچھی اور بری شے نشر کی جانے لگی ایک طرف اگر معلومات کا خزانہ ہوتیں تو دوسری طرف کئی انسانوں کے لئے منفی بھی ثابت ہوتیں



ساتھ اور سڑ کی دہائی میں ٹی وی پر ہر نئی شے کو دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر یہ ہوتا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے وغیرہ۔ بات کچھ عجیب سی ہے کہ کچھ لوگ سائنسی ایجادات کو مانتے ہوئے عیش عیش کرتے ہیں ایجادات سے مستفید ہوتے ہیں اور پھر اسے برا بھی سمجھتے ہیں۔ سائنس اگرچہ خود ترقی نہیں کرتی بلکہ انسان اپنے دماغ اور سوچ کو بروئے کار لا کر اس کھوج میں رہتا ہے کہ کچھ نیا ایجاد کیا جائے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہر انسان ایک سائنس دان ہے یعنی اسکا دماغ اتنا فاسٹ ہے کہ وہ چاہے تو ہر سیکنڈ میں نئی سوچ سے دنیا تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن افسوس کہ کچھ لوگ اپنا دماغ استعمال کرتے ہیں اور کچھ جانتے ہی نہیں کہ دماغ آخر ہوتا کیا ہے۔ مستقبل قریب یعنی دو ہزار سیکھیں تک سائنسی دنیا میں نیا انقلاب آجائے گا آنے والے سات آٹھ برسوں کے اندر ہم کئی پرانی اشیاء سے محروم ہو جائیں گے اور یہ اشیاء ماضی کا حصہ کہلاتے ہوئے اینٹک ٹار کی جائیں گی جیسے کہ آج کل ٹرانزسٹر یا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے آج کی جرنیشن نہیں جانتی کہ کیسٹ ریکارڈر کیا ہوتا ہے۔ ہائی ٹیک یعنی ہائی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں سپید پکڑ چکی ہے اور ہر انسان کی ضرورت بھی بن گئی ہے کیونکہ جتنی تیزی سے سائنس ترقی کر رہی ہے انسان کیلئے سہولت پیدا ہو رہی ہے اتنی تیز رفتاری سے انسان ست اور نکما ہوتا جا رہا ہے۔ لیکویڈ کرسٹل ڈسپلے جنہیں ایل سی ڈی ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر اپنی مخصوص بناوٹ سے دنیا بھر میں مقام حاصل کر چکے ہیں اور موٹی فونڈ والے ٹی وی کو کچرے کے ڈبے یعنی ری سائیکلنگ کمپنیز کو واپس کر دیا گیا ہے آج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں کیونکہ ایل سی ڈی ٹی وی بہت پتلے یعنی سارٹ ہونے کے ساتھ بہت کم جگہ لیتے اور آج کل بہت ارزوں قیمت پر دستیاب ہیں اسلئے باوجود گزشتہ برس ایل جی کمپنی نے مستقبل کیلئے ایک نیا ٹی وی متعارف کروایا ہے جسے اورگائیک لائٹ ایمینٹ ڈاؤڈ یعنی او ایل ای ڈی کا نام دیا یہ نیا ٹی وی اپنی منفرد لائٹس سے فکشن کرے گا جس سے انرجی کی بچت ہوگی اور آج کل کے فور کے ٹی وی سے زیادہ صاف وشفاف تصویر پیش کرے گا علاوہ ازیں یہ حیرت انگیز ٹی وی کانڈکٹر کی طرف باریک ہونے کیساتھ رول اور فولڈ کیا جاسکے گا کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے اس ڈیپو سیریز یعنی وال پیپرز کی موٹائی اندازً دو سے تین ملی میٹر ہوگی متنطبیسی سسٹم سے دیوار میں ایڈجسٹ کیا جاسکے گا عام استعمال کے لئے اس سال کے آخر میں مارکیٹ میں دستیاب ہو گا۔ لیڈ لیپ۔ عام بلب یا انرجی سیور لیپس بہت جلد مارکیٹ سے ہٹا دئے جائیں گے انکی جگہ پر کرنے کیلئے او لیڈ لیپ دستیاب ہونگے ان سنے لیپ کا موازنہ ایل جی کے ٹی وی سسٹم سے کیا جا سکتا ہے معروف کمپنیز فلیس اور اوسرام بہت جلد یہ لیپ متعارف کروائیں گی۔ سٹورج میڈیا۔ آج کل سی ڈیز، ڈی وی ڈیز، ڈسک کے علاوہ یو ایس بی سٹکس پر تمام ڈیٹا منتقل کرنے کے بعد سٹورج کیا جاتا ہے جبکہ آنے والے برسوں میں یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا اور اسکی جگہ بوکس، ایمزرون اور گوگل کمپنیز ایک نیا سٹورج میڈیا متعارف کروائیں گے جس میں وائی فائی سسٹم کے تحت آن لائن ڈیٹا سٹور کیا جا سکے گا۔ گیم کونزولز۔ گیمز کھیلنے والے یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کنزولر یا دیگر کونزولز کے بغیر اپنی من پسند گیم ایکس بوکس یا پلے سٹیشن پر کھیل سکیں لیکن مستقبل قریب میں این وائی ڈیٹا کمپنی کونزولز فری کلاؤڈ گیم سسٹم متعارف کروائے گی جس سے گیمز کھیلی جائیں گی یہ کمپنی جی فورس ناؤ گیم سٹریمنگ سروس کے ذریعے گیم کھیلنے والوں کیلئے سہولت پیدا کرے گی علاوہ ازیں اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ سسٹم کو بھی ریموٹ سرور کے ذریعے ہائی ٹیک طریقے سے استعمال کیا جا سکے گا۔ کیبل چارجز۔ سیمٹک کمپنی نے حال ہی میں کیبل فری چارجز متعارف کروایا ہے ایک مخصوص پیڈ کے ذریعے سمارٹ فونز، لیپ ٹاپ اور دیگر الیکٹرونک انسٹرومنٹس چارج کئے جا سکیں گے، پلگ یا ایڈیٹرز کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی، اپیل کمپنی نے بھی کیبل فری ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی ہے جس سے تمام آلات کیبل کے بغیر چارج کئے جائیں گے۔ ریموٹ کنزولز۔ پروگرامنگ

اور دیگر فنکشن کے لئے ریوٹ کنٹرول کی بجائے وائس سسٹم سے تمام آلات فنکشن کریں گے اس سسٹم کیلئے سینسور استعمال کیا جائے گا مثلاً ایکس بوکس یا پلے سٹیشن کو ٹی وی کے والیم سے منسلک کرنے کے بعد وائس کنٹرول سے استعمال کیا جاسکے گا۔ پلاسٹک کارڈز اور پاس ورڈز سسٹم بھی جلد ختم کرنے کے بعد تمام ڈیٹا سمارٹ فونز پر منتقل کرنے سے ہر قسم کی شاپنگ کی جاسکے گی ہائیو میٹرک سینر اور ہائی ٹیک الفا بیلک سسٹم کے علاوہ فنگر پرنٹس اور چہرے کی شناخت سے تمام عوامل باآسانی ملے پائیں گے۔ انسان ایک طرف کہتا ہے کہ سائنس ترقی کر رہی ہے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسری طرف سائنسدانوں کو برا بھلا بھی کہا جاتا ہے۔ چارلی چیپن آج زندہ ہوتا تو بہترین ایکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سائنسدان بھی ہوتا جو ہستے ہستے بہت کچھ دریافت کرتا اور لوگ اس کی تعریف بھی کرتے۔

بہتر گھر

مصنف: یوسف

ایک شخص نے بہتر گھر خریدنے کیلئے اپنا پہلے والا گھر بیچنا چاہا۔

اس مقصد کیلئے وہ اپنے ایک ایسے دوست کے پاس گیا جو جائیداد کی خرید و فروخت میں اچھی شہرت رکھتا تھا۔

اس شخص نے اپنے دوست کو مدعا سنانے کے بعد کہا کہ وہ اس کے لئے گھر برائے فروخت کا ایک اشتہار لکھ دے۔

اس کا دوست اس گھر کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اشتہار کی تحریر میں اُس نے گھر کے محل وقوع، رقبے، ڈرائیون، تعمیراتی مواد، باغیچے، سونگ پول سمیت ہر خوبی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

اعلان مکمل ہونے پر اُس نے اپنے دوست کو یہ اشتہار پڑھ کر سُنا یا تاکہ تحریر پر اُسکی رائے لے سکے۔

... اشتہار کی تحریر سن کر اُس شخص نے کہا، برائے مہربانی اس اشتہار کو ذرا دوبارہ پڑھنا اور اُس کے دوست نے اشتہار دوبارہ پڑھ کر سُنا دیا۔

اشتہار کی تحریر کو دوبارہ سن کر یہ شخص تقریباً چیخ ہی پڑا کہ کیا میں ایسے شاندار گھر میں رہتا ہوں؟

اور میں ساری زندگی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھتا رہا جس میں کچھ ایسی ہی خوبیاں ہوں۔ مگر یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں تو رہ ہی ایسے گھر میں رہا ہوں جس کی ایسی خوبیاں تم بیان کر رہے ہو۔ مہربانی کر کے اس اشتہار کو ضائع کر دو، میرا گھر بکاؤ ہی نہیں ہے۔

ایک بہت پرانی کہانت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کو ایک کانڈ پر لکھنا شروع کر دو، یقیناً اس لکھائی کے بعد تمہاری زندگی اور زیادہ خوش و خرم ہو جائے گی۔

اصل میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا ہی بھلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ جو کچھ برکتیں اور نعمتیں ہم پر برس رہی ہیں ہم ان کو گنتا ہی نہیں چاہتے۔

ہم تو صرف اپنی گنتی جتنی چند پریشانیاں یا کمی اور کوتاہیاں دیکھتے ہیں اور برکتوں اور نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

کسی نے کہا: ہم شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ نے پھولوں کے نیچے کانٹے لگا دیئے ہیں۔ ہونا یوں چیلئے تھا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اُس نے کانٹوں کے اوپر بھی پھول اگا دیئے ہیں۔

ایک اور نے کہا: میں اپنے شکوے پیروں کو دیکھ کر کڑھتا رہا، پھر ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو شکر کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔

اب آپ سے سوال

کتنے ایسے لوگ ہیں جو آپ جیسا گھر، گاڑی، ٹیلیفون، تعلیمی سند، نوکری وغیرہ، وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں؟

کتنے ایسے لوگ ہیں جب آپ اپنی گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے ہو تو وہ سڑک پر شکوے پاؤں یا پیدل جا رہے ہوتے ہیں؟

کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پر چھت نہیں ہوتی جب آپ اپنے گھر میں محفوظ آرام سے سو رہے ہوتے ہیں؟

کتنے ایسے لوگ ہیں جو علم حاصل کرنا چاہتے تھے اور نا کر سکے اور تمہارے پاس تعلیم کی سند موجود ہے؟

کتنے بے روزگار شخص ہیں جو فاقہ کشی کرتے ہیں اور آپ کے پاس ملازمت اور منصب موجود ہے؟

اور وغیرہ وغیرہ ہزاروں باتیں لکھی اور کہی جاسکتی ہیں۔۔۔۔۔

کیا خیال ہے ابھی بھی اللہ کی نعمتوں کے اعتراف اور اُکا شکر ادا کرنے کا وقت نہیں آیا کہ ہم کہہ دیں

یا رب لک الحمد کما ینبغی لجلال وجسک وعظیم سلطانتک

اللہم لک الحمد حتی ترضی و لک الحمد إذا رضیت و لک الحمد بعد الرضا

